103 ASR Makky Verses 3

سورۂ عصر

مکہ مکرمہ میں نازل ہوا۔ اس میں تین آیتیں ہیں

ماقبل سے ربط سورت ماقبل سے اس سورت شریفہ کا ربط اس طرح ہے کہ سورت ماقبل یعنی سورۂ تکاثر میں ان لوگوں کا حال بیان فرمایا گیا تھا جن کو مال و اولاد کی کثرت کے خیال نے اللہ سبحانہ کی یاد سے غافل کر رکھا تھا۔ اس سورت شریفہ میں ان سعادتمند لوگوں کا بیان فرمایا جا رہا ہے جن کو مال و دولت اور اولاد کے خیال نے یاد الٰہی سے غافل نہیں کیا۔ وہ مدۃ العمر یاد الٰہی میں لگے رہے۔ یہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ تکاثر کے بعد سورۂ عصر کو جگہ دی گئی ہے۔ نیز سورت سابقہ میں مال و اولاد کی کثرت کے دھن میں لگے رہنے سے منع کیا گیا تھا اور ایسے لوگوں کی مذمت فرمائی گئی تھی یہ سلبی پہلو تھا یہاں یہ سوال ہوتا تھا کہ پھر انسان کو کس دھن میں لگا رہنا چاہیے یعنی اس کا ایجابی پہلو کیا ہے؟ اس کا جواب اس سورت شریفہ میں دیا جا رہا ہے لہذا اس اعتبار سے ماقبل کے ساتھ مناسبت اور وجہ ارتباط ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا 103-1
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ؏ 103-2 103-3

قسم ہے زمانے کی۔ بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔ مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور کئے اچھے کام۔ اور آپس میں تاکید کرتے رہے سچ کی۔ اور آپس میں تاکید کرتے رہے سہنے کی۔

تمہید | والعصر۔ قسم ہے زمانے کی۔ یعنی سارا زمانہ گواہ ہے اور ثبوت پیش کر رہا ہے اس دعوے کا جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔ قرآن کریم میں کہیں مکان کی قسم کھائی گئی تھی۔ مثلاً لا اقسم بھذا البلد وانت حل بھذا البلد۔ قسم ہے اس شہر (مکہ مکرمہ) کی درحالیکہ آپ اے نبی کریم! فاتحانہ داخل ہونے والے ہیں اس شہر میں۔ بلد حرام کی حرمت کی کوئی پابندی اس وقت آپ پر لازم نہیں رہیگی۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا:۔ وھذا البلد الامین اور قسم ہے اس امانت والے شہر (مکہ مکرمہ) کی۔ یہاں زمان کی قسم کھائی جا رہی ہے۔ بہرحال مکان کی قسم سے جس طرح مکان با عظمت قرار پا چکا ہے

زمان بھی اس کی قسم دی جانے سے باعظمت و احترام ہے۔ اس کی بھی قدر کیجانی چاہیئے۔ رہا یہ امر کہ والعصر سے کیا مراد ہے مفسرین کرام کے مختلف اقوال ہیں۔

العصر سے مراد زمانہ ہے بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ والعصر سے الدھر یعنی پورا زمانہ مراد ہے کسی زمان خاص کی تخصیص نہیں۔ اس قول کی تائید میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ آپ نے بعض اوقات یوں فرمایا:۔ والعصر نوائب الدھر۔ قسم ہے زمانے کی یعنے زمانے بھر میں جو واقعات و حالات اور حوادث نوبت بہ نوبت یکے بعد دیگرے پیش آتے رہتے ہیں"۔ گویا آپ نے والعصر کی تفسیر نوائب الدھر سے فرمائی۔ نیز اس قول کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ زمانہ اگرچہ بظاہر ایک معدوم شئی معلوم ہوتا ہے جس کا خارج میں کوئی وجود خاص نہیں با ایں ہمہ اس میں عجیب عجیب واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ کل تک ایک قوم دنیا میں ذلیل اور ناقابل ذکر خیال کی جاتی تھی۔ آج اس کی دنیا میں بڑی قدر و منزلت ہے۔ ہر شخص کی زبان پر اس کا چرچا ہے۔ اس کے برعکس کل تک کسی کی حکومت بڑے رعب وجلال کے ساتھ قائم تھی۔ آج اس کا کوئی ذکر نہیں۔ قوموں کا عروج و زوال، روز روز کا تبدل احوال، موسم کا تغیر، موت و حیات، روشنی و تاریکی وغیرہ یہ تمام امور ہمہ اسی

زمانہ کی نیرنگی کے کرشمے ہیں۔ چونکہ زمانے کا کوئی خاص وجود خارجی نہیں معلوم ہوتا اسلئے وہ ساکن یعنی غیر متحرک معلوم ہوتا ہے حالانکہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ رواں ہے۔ اسکی جو آن گزرجاتی ہے پھر پلٹ کر نہیں آنے پاتی بلکہ دوسری نئی آن ہی سے سابقہ رہتا ہے۔ دنیا کی ایک ایک چیز فنا ہوتی نظر آتی ہے مگر زمانہ فنا ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس سے زمانہ کی طوالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ استاد جلیل نے کیا خوب فرمایا :-

زمانہ ہے کہ گزرا جارہا ہے یہ دریا ہے کہ بہتا جارہا ہے

ایک عرب شاعر کہتا ہے :-

واری الزمان سفینۃ تجری بنا نحوالمنون ولانری حرکاتہ

میں زمانے کو خیال کرتا ہوں کہ وہ ایک کشتی یا جہاز ہے جو ہم سب کو اس میں سوار کرکے موت کی سمت تیزی سے رواں دواں ہے اس کے باوجود اس کی حرکت ہمیں نظر نہیں آتی "

زمانہ کی اہمیت العصر یعنی زمانے کی قسم اس لئے کھائی گئی کہ انسان کو جو مصائب اور آفات پہنچتے ہیں ان کو وہ زمانے کی طرف ہی منسوب کرتا ہے اور شکایت کرتا رہتا ہے کہ عجب زمانہ سے سابقہ پڑرہا ہے کہ مجھے ایسی تکالیف

اور نقصانات کا منہ دیکھنا پڑا۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے بھی اسی زمانے کو گواہ رکھکر
اس سورت شریفہ کی ابتدا فرمائی کہ واقعی زمانہ ایک مہتم بالشان حقیقت ہے لیکن
مصائب و آلام اور نفع و ضرر کو زمانے کی طرف منسوب کرنا اور اس کی شکایت
کرتے رہنا صحیح نہیں بلکہ اس کا اصلی سبب انسان کی کوتاہ فہمی اور سوء تدبیر ہے
جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا:۔ ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم
"تم کو جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے" اور حدیث
شریف میں آیا:۔ لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر۔ "زمانے کو برا
نہ کہو کیونکہ اللہ سبحانہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے" یعنی زمانہ کی گردش اسی کے ہاتھ ہے
تم اچھا کام کرتے رہو تو زمانہ بھی تمہارا ساتھ دیگا ورنہ اپنے کئے کو آپ بھگتے جاؤ۔

عصر سے آخر نہار مراد ہے

العصر کی دوسری تفسیر آخر نہار کے ساتھ کی گئی
ہے۔ حضرت قتادہ اور ابو مسلم خراسانی کا یہی قول ہے۔ اللہ سبحانہ نے دوسرے
مقامات پر جہاں والفجر اور والضحیٰ فرمایا جس سے اول نہار مراد ہے اور
فجر صادق کو گواہ ٹھہرایا گیا جبکہ لوگ نیند سے بیدار ہوتے اور چاشت کے وقت
اپنے کاروبار شروع کرتے ہیں۔ یہاں العصر یعنی آخر نہار کو گواہ ٹھہرایا جا رہا
ہے۔ رات کو مردے کی طرح دراز ہو کر بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد صبح

جاگ کر اور چاشت کے وقت کاروبار شروع کرتے اور اپنی زندگی کا ثبوت دیتے ہیں اور جب دن ختم ہوتا آتا ہے تو پھر ان پر مُردنی چھا جاتی اور اپنے گھروں کو واپس آتے ہیں لہٰذا غور طلب امر یہ ہے کہ اس دن بھر میں کیا کام کیا اور اس میں کیا کمایا؟ اگر کچھ نہیں کیا اور نہ کچھ کمایا تو ابھی موقع ہے کہ کچھ کر لے اور کما لے۔ اگر اس غنیمت موقع کو بھی اپنی غفلت سے کھو دیا تو خالی ہاتھ رہ جانا پڑے گا اور کفِ افسوس ملنا ہوگا جس سے کچھ حاصل نہیں۔

عصر سے مراد نماز عصر بعض مفسرین کرام نے العصر سے نماز عصر مراد لی ہے۔ کیونکہ دنیائے اسلام میں اس سے نماز عصر ہی عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ جو وارد ہوا ہے کہ نمازوں کی حفاظت کرو یعنی ان کو اپنے وقت مقرر پر ادا کرو خصوصاً درمیانی نماز کی (حفاظت کا زیادہ اہتمام کرو)۔ غزوۂ احزاب میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز عصر قضا ہو گئی تو آپ نے لشکر کفار کے بارے میں فرمایا: ۔ ملأ اللہ قبورھم نارا حیث شغلونا عن الصلاۃ الوسطی ۔ خدا ان کی قبروں میں آگ بھر دے کیونکہ انھوں نے درمیانی نماز کو وقت پر ادا کرنے کا موقع نہ دیا۔ یہاں آپ نے صلوٰۃ وسطیٰ کی تفسیر نماز عصر سے فرمائی۔ نماز عصر کے باب میں

حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: من فاتتہ صلاۃ العصر فکأنما وتر اھلہ ومالہ ۔ جس کی نماز عصر قضا ہوگئی گویا کہ اس کا سارا خاندان اور تمام مال و متاع برباد ہوگیا۔ فرض کرو کہ کسی نے عصر کے وقت سب کچھ کمایا لیکن نماز عصر ہی ادا نہ کی تو گویا اس نے اپنی ساری کمائی برباد کرلی اور خود بھی معہ اپنے خاندان کے ہلاک و برباد ہوا۔ نماز عصر کا اہتمام زیادہ تر اس وجہ سے بھی منظور ہے کہ عموماً یہ وقت ٹھنڈا سہانا ہوتا ہے۔ لوگ کاروبار میں زیادہ مشغول رہتے ہیں۔ بازار کھلے رہتے ہیں۔ لوگوں میں چہل پہل رہتی ہے۔ ان حالات میں اکثر اندیشہ رہتا ہے کہ لوگ دنیوی کاروبار میں مشغول رہ کر اس فریضۂ الٰہی سے جو بہت مہتم بالشان ہے کہیں غافل نہ رہ جائیں۔ آخرت سے غافل رہ کر اگر کسی نے ساری دنیا کمائی تو وہ کس کام کی؟ فانی کے پیچھے باقی کو ضائع کردیا۔

العصر سے مراد عہد مبارک نبوی بعض مفسرین نے العصر سے حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس عالم میں رونق افروز رہنے کا زمانہ مراد لیا ہے۔ جو تمام زمانوں سے (خواہ وہ ماضی ہو یا حال یا مستقبل) اولیٰ، افضل اعلیٰ اور اکمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ قسم اسی طرح ہوگی جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا: ـــ

لعمرك قسم ہے آپ کی عمر شریف اور آپ کی بقا کی " کہ اسی کی بدولت تمام دنیا کی ظلمت کافور ہوئی اور آپ نے دین اسلام کی وہ روشنی پھیلائی جو قیام قیامت تک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی ۔ کروڑوں ، اربوں نفوس کا تزکیہ ہوا اور قلوب جلا پائے اور تا قیامت کروڑوں اربوں نفوس و قلوب اس نور مجسم کی ضیا پاشیوں سے منور ہوتے رہیں گے ۔ یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون (کفار) چاہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کا نور جو آپ کی ذات ستودہ صفات میں جلوہ گر ہوا ہے اُس کو اپنے منہ کی پھونک سے بجھا دیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو اپنے کمال پر پہنچانے کا تہیہ کر لیا ہے اگرچہ یہ بات کفار کو کتنی ہی ناگوار ہو "

العصر سے مراد امۃ مرحومہ کا عہد | بعض مفسرین کرام نے والعصر سے امۃ مرحومہ کا عہد مراد لیا ہے جو امم سابقہ کے عہد کے مقابلے میں نماز عصر کے وقت کی نسبت رکھتا ہے ۔ جیسا کہ بخاری شریف کی اس حدیث صحیح میں ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے :۔ انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انما بقاؤکم فیما سلف قبلکم من الامم کما بین صلاۃ العصر الی غروب الشمس اوتی اھل التوراۃ التوراۃ فعملوا حتی اذا

انتصف النہار عجزوا فاعطوا قیراطا قیراطا ثم اوتی اھل الانجیل الانجیل فعملوا الی صلاۃ العصر ثم عجزوا فاعطوا قیراطا قیراطا ثم اعطینا القرآن فعملنا الی غروب الشمس فاعطینا قیراطین قیراطین۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ انھوں نے حضور رسول اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ ارشاد فرما رہے تھے کہ امم سابقہ کے مقابلے میں تمھاری بقا کی نسبت اتنی ہی ہے جتنی کہ نماز عصر سے غروب آفتاب کے درمیانی مدت ہے۔ تورات والوں کو تورات شریف دی گئی وہ اس پر (صبح سے) عمل پیرا رہے۔ جب نصف النہار ہوا تو وہ تھک گئے (اور کام چھوڑ دیا) لہذا انکو ایک ایک قیراط دیا گیا۔ پھر انجیل والوں کو انجیل مقدس دیا گیا وہ اس پر (نصف النہار سے) عمل کرتے رہے۔ جب عصر کا وقت آیا تو وہ بھی تھک کر بیٹھ گئے۔ ان کو بھی ایک ایک قیراط (ان کے کام کے صلے میں) دیا گیا۔ پھر ہم کو قرآن کریم عنایت ہوا۔ ہم (عصر سے) غروب آفتاب تک کام کرتے رہے (اور کام کی تکمیل کر دی) تو ہم کو دو دو قیراط صلہ مرحمت ہوا۔"

اہل کتاب کا اعتراض اور اس کا جواب

فقال اھل الکتابین ای ربنا اعطیت ھؤلاء قیراطین قیراطین واعطینا

قیراطا قیراطا ونحن اکثر عملا قال اللہ عزّ وجل هل ظلمتکم من اجرکم من شیئ قالوا لا قال وهو فضلی اوتیه من اشآء۔

اس پر اہل کتاب کے ان دونوں گروہوں نے عرض کیا۔ پروردگارما! آپ نے ان لوگوں کو دو دو قیراط مرحمت فرمائے اور ہم کو ایک ایک قیراط ہی عنایت ہوا۔ حالانکہ ہمارا کام ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ خدائے عزوجل کا ارشاد ہوا۔ کیا ہم نے تمھارے اجر مقرر کردہ میں کسی قسم کی کوئی کمی کی؟ سبھوں نے عرض کیا کمی تو نہیں ہوئی (جس قدر قرارداد ہوئی تھی اس کے مطابق ہی تقسیم عمل میں آئی) اس پر ارشاد باری ہوا کہ (ان لوگوں کو جو دو دو قیراط دئے گئے) یہ ہمارا فضل اور عنایت و مرحمت ہے۔ ہم اس سے جس کو چاہیں سرفراز کریں" پھر شکایت کا کیا محل ہے؟ ۔

جامع تفسیر بہرحال العصر سے جو بھی مراد لی جائے ہر ایک تفسیر اپنی جگہ درست ہے خواہ پورا زمانہ لیا جائے یا اس کا کوئی جزو خاص۔ ہمارے نزدیک پورا زمانہ مراد لینا ہی اولیٰ ہے جس میں تمام مخصوص زمانے بھی داخل ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے والعصر سے پورا زمانہ مراد ہونا لکھا ہے یعنی سارا زمانہ گواہ ہے اُس دعوے کے صحیح ہونے کا جس کا بیان آگے آرہا ہے۔ اور اس کا ایک ایک جزو ثبوت پیش کر رہا ہے اس امر کا کہ آگے جو تقریر آرہی ہے وہ اپنی جگہ اٹل ہے جس کی تردید نہیں ہوسکتی۔ وہ دعویٰ یہ ہے:۔

ان الانسان لفی خسر کی تفسیر ان الانسان لفی خسر۔ بیشک انسان سخت گھاٹے میں ہے۔" اب یہاں انسان سے کیا مراد ہے۔ اس میں بھی مفسرین کرام کے اقوال ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی فرماتے ہیں:۔ انه اراد جماعة من المشركين كالوليد بن المغيرة والعاصی بن وائل والاسود بن عبد المطلب۔ (نیشاپوری) یہاں الانسان سے مشرکین کی ایک جماعت مراد ہے۔ جیسے ولید بن مغیرہ عاص بن وائل اور اسود بن عبدالمطلب" وغیرہ جو کٹر مشرکین تھے

اور اہل مکہ کے سردار مانے جاتے تھے۔ اور حضرت مقاتل فرماتے ہیں:۔ انہ ابو لھب۔ یہاں الانسان سے ابولہب مراد ہے۔" جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ اور حضور کی قرابت کا کچھ بھی پاس و لحاظ نہیں کرتا تھا۔ اور اسی دشمنی کے باعث حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو صاحبزادیاں جو اس کے بیٹوں سے منسوب تھیں ان کو اپنے بیٹوں سے طلاق دلوادی تھی۔ جس کی مذمت میں سورۂ تبت یدا ابی لھب نازل ہوا۔ اور ایک حدیث مرفوع میں ہے:۔ انہ ابو جھل۔ یہاں الانسان سے ابوجہل لعین مراد ہے۔" جس کی دشمنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مشہور ہے۔ یہ سب کہا کرتے تھے:۔ ان محمدا لفی خسار۔ یقیناً محمد گھاٹے میں ہیں۔" جو ہمارے آلھہ کو چھوڑ کر اللہ واحد کی عبادت کرنے کی تعلیم دیا کرتے ہیں۔ بھلا تین سو ساٹھ خداؤں سے منہ موڑ کر خدائے واحد کے پیچھے جا کر کیا فائدہ کمائیں گے اور اتنے زیادہ خداؤں کی مخالفت مول لے کر ان کی گرفت سے کس طرح بچ سکیں گے اور ان سب کے مقابلہ میں ان کا اکیلا خدا کیا کرے گا؟ بجز خسارے کے ان کو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر جمہور مفسرین نے الانسان سے تمام افراد انسان مراد لی ہے۔ جس میں ولید، عاص، اسود، ابولہب اور ابوجہل اور ان کے

نیک کام کیا اگر اول درجہ کا نیک کام کیا ہوتا تو اول درجہ کا ثواب حاصل کرتا۔ انسان کی یہ حسرت بھی گونہ نقصان اور گھاٹا ہی ہے اسی لئے فرمایا گیا کہ سب انسان گھاٹے میں ہیں۔

اِلَّا کی تفسیر اِلَّا۔ مگر" وہ جن کا بیان آگے آرہا ہے وہ اس خسرِ عظیم سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کو کسی قسم کے نقصان اور گھاٹے کا اندیشہ نہیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنے آپ کو ایسے نقصان عظیم پانے والوں سے دور رکھا ہے۔ اور بالکلیہ ان سے اپنا تعلق منقطع کرلیا ہے۔ ان کا عقیدہ، اُن کے عقیدے سے، ان کا قول قرار، اُن کے قول قرار سے، ان کا عمل اُن کے عمل سے، ان کی روش، اُن کی روش سے، بلکہ ان کی پوری زندگی، ان کی پوری زندگی سے جدا گانہ ہے۔ اگر کوئی ان دونوں گروہوں پر نظر ڈالے تو بادی النظر ہی میں صاف طریقہ پر محسوس ہوتا اور دکھائی دیتا ہے کہ یہ اور ہیں اور وہ اور ہیں۔ دونوں میں باہم کوئی مناسبت اور یکسانیت نہیں۔ جب یہ دونوں گروہ الگ الگ ٹھہرے تو ظاہر ہے کہ ان کا انجام بھی ایک نہ ہوگا بلکہ ہر ایک کا انجام اس کے عقیدے، قول قرار، عمل روش اور طرز زندگی کے مطابق جدا ہوگا۔ یہ مستثنیٰ گروہ کن صفات کا حامل ہے اس کا بیان آگے آرہا ہے :—

جملہ ہم خیال وہم عقیدہ سبھی داخل ہیں۔ ہم نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ اگر فی الواقع یہ آیۂ کریمہ ان مخصوص مشرکین کے بارے میں نازل بھی ہوئی ہو تو بموجب العبرۃ العموم اللفظ لا لخصوص السبب کے اعتبار عام لفظ کا ہوگا۔ سبب خاص کا اعتبار نہ ہوگا۔ اس اصول کے مد نظر الانسان سے پوری نوع انسانی مراد ہوگی۔ اور آیۂ کریمہ کے معنی یہ ہوں گے کہ نوع انسان یعنی جس جس شخصیت پر "انسان" کا اطلاق ہو سکتا ہے وہ سب کے سب بڑے خسارے اور سخت گھاٹے میں ہیں۔ گویا انسانیت ہی پرلے درجے کے نقصان میں پڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ خسر کی تنوین سے تنوین تعظیم مراد لی گئی ہے یعنی لفی خسر عظیم۔ انسان سب کے سب بڑے گھاٹے اور خسارے میں ہیں۔ یہ اس لئے کہ انسان کو جو کچھ کرنا ہے وہ اسی دوروزہ زندگی میں کرنا ہے اگر نافرمانی اور معاصی میں گزار دیا جائے گا تو نقصان اور گھاٹا ظاہر ہے اور اگر مباحات میں پڑے رہو گے جن کے کرنے پر نہ کوئی ثواب اور نہ عذاب۔ تو اس کا نتیجہ بھی لا حاصل ہی رہیگا۔ اور اگر طاعات وعبادات میں مشغول رہو گے تو ان کے مدارج بھی بے شمار ہیں جس درجہ اخلاص ہوگا اور جتنا ان میں انہماک رہیگا اس سے اعلیٰ وارفع درجہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور یقیناً اعلیٰ وارفع کی جزا بھی اعلیٰ وارفع ہی ہوگی۔ اس صورت میں ہر نیک سے نیک تر انسان کو حسرت ضرور رہیگی کہ میں نے دوم درجہ کا

الذین آمنوا کی تفسیر الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ (ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ) یقین لائے۔" (خدائے واحد پر جو تمام صفات کمالیہ کا جامع اور ہر عیب سے منزہ ہے۔ یعنی جملہ صفات کمالیہ جو خداوند تعالیٰ شانہ کی ذات میں ہونی چاہئیں وہ سب کی سب اس میں موجود اور وہ ان صفات سے موصوف ہے۔ اور جو صفات ایسی ہیں جو شان خداوندی کے لائق نہیں وہ ان تمام صفات سے پاک ہے) مثلاً وہ حَیّ ہے ہمیشہ زندہ رہنے والا۔ اس کو کبھی فنا نہیں۔ وہ علیم ہے سب کچھ جاننے والا۔ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ سمیع ہے سب کچھ سنتا ہے بہرا نہیں ہے۔ بصیر ہے۔ سب کچھ دیکھتا ہے اندھا نہیں ہے۔ متکلم ہے کلام فرماتا ہے۔ گونگا نہیں ہے۔ اس کا سننا، دیکھنا، کلام فرمانا ہمارے سننے دیکھنے اور کلام کرنے کی طرح نہیں۔ ہم ان صفات کے لئے کان، آنکھ، زبان کے محتاج ہیں اس کو کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ اسی کلام کا نتیجہ ہے کہ اس نے کتابیں نازل فرمائیں جن میں عقائد، عبادات اوامر نواہی، معاملات، اخلاق، آداب سب کچھ بتلا دیئے اور ان کے نتائج کا علم کرا دیا گیا۔ نیز ہر چیز کے حدود متعین کئے گئے اور کوئی چیز نہیں چھوڑی گئی جس کی ضرورت ہو۔ وہ مرید ہے۔ ہر کام اپنے ارادے اور اختیار سے کرتا ہے۔ مجبور نہیں ہے۔ قدیر ہے ہر چیز پر اس کو

پوری قدرت ہے۔ عاجز نہیں ہے۔ غرض ہر وصف میں وہ یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں لیس کمثلہ شیئ کوئی چیز بھی اس کی مانند نہیں ہے۔ اور اسی قدرت کاملہ کا ظہور ہے کہ تمام مخلوقات پیدا کئے گئے۔ ملائکہ انبیاء رسل علی نبینا وعلیہم الصلاۃ والسلام کو امتیاز بخش گیا۔ اور انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام کے ذریعہ کتب الٰہی کو پڑھنے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کے طور طریق بتائے گئے۔ پھر ان تمام بزرگوں کے آخر پر حضرت ختم الانبیاء والمرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیہم اجمعین کو مبعوث فرمایا گیا جن کے بعد پھر کوئی نبی نہیں۔ اور آپ پر اللہ سبحانہ کی آخری کتاب قرآن کریم نازل کی گئی جس کے بعد قیامت تک کوئی آسمانی کتاب نازل نہ ہوگی اور آپ کی امۃ مرحومہ کو آخر الامم قرار دیا گیا جس کے بعد حق سبحانہ تعالیٰ کی محبوب و مقبول امت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس طرح اکمال دین اور اتمام نعمت فرمادیا گیا اور اعلان فرمایا گیا:۔ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔ آج (۹ ذی الحجۃ الحرام ۱۰ھ کو) میں نے تمہارے دین کو درجہ کمال پر پہنچا دیا اور اپنی پوری نعمت تم پر اتار دی۔ اور تمہارے دین اسلام سے رضامند و خوشنود ہو گیا۔ پس اس کو حرز جان بناؤ اور اس پر ہمیشہ پوری قوت سے قائم و برقرار رہو۔ کوئی قوت اس نعمت جاوید کو تم سے چھین نہیں سکتی

اور کوئی طاقت تم کو اس صراط مستقیم سے ہٹا نہیں سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ تم خود اسکی قدر نہ جانو۔ بہرحال اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا میں جملہ ایمانیات داخل ہیں جو ایمان مجمل ومفصل میں بتادیے گئے ہیں۔ اور جن کی صراحت کتب عقائد وکلام میں شرح و بسط کے ساتھ کردی گئی ہے اور ہر امر کا ثبوت دلائل معقول ومنقول سے بہم پہنچادیا گیا ہے۔ ان کو پڑھو اگر پڑھنا نہیں جانتے تو جاننے والوں سے دریافت کرلو۔

عملوا الصالحات کی تفسیر وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ۔ ایمان کے بعد درجہ ہے عمل صالح کا۔ یعنی نیز خسران مبین سے وہ گروہ مستثنیٰ ہے جو اعمال صالحہ اور کارہائے شائستہ کے پابند اور خوگر اور ممنوعات ومکروہات سے دور ہیں"۔ چنانچہ حضرت مجاہدؒ ارشاد باری تعالیٰ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔ وادّوا ما الزمهم من فرائضه واجتنبوا ما نهاهم عنه من معاصيه۔ (ابن جریر) عملوا الصالحات کا مصداق وہ لوگ ہیں جو فرائض لازمہ کو ادا کرتے رہے اور جن معاصی کے ارتکاب سے ان کو منع فرمایا گیا تھا ان سے اجتناب کرتے رہے"۔ پھر یہ ادائی فرائض اور اجتناب عن المعاصی جو ہر شخص پر واجب ہے وہ ہر ایک کی استعداد اور اس کی استطاعت کے موافق ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر شخص کی استعداد و استطاعت یکساں نہیں ہوسکتی۔

جیسا کہ اللہ پاک کا ارشاد ہے :۔ فمنھم ظالم لنفسہ ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرات باذن اللہ ۔ کوئی اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہوتا ہے اور کوئی ان میں میانہ روی اختیار کرنے والا ہے اور کوئی ان میں ایسے بھی ہیں جو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کے حکم سے اپنی نیکیوں کو ساتھ لے کر سبقت لے جانے والے ہوتے ہیں ۔" نیز حق سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔ خدائے بزرگ و برتر کسی جان کو اتنا ہی مکلف بنایا ہے جتنی اس کی وسعت و طاقت ہے ۔" استعداد اور استطاعت سے بڑھ کر کسی کو کسی امر کی تکلیف نہیں دیتا۔ عوام سے اہل علم کے فرائض متعلق نہیں کئے جاتے ۔ اور اہل علم بھی ایک درجے کے نہیں ہوتے ۔ فوق کل ذی علم علیم ۔ ہر صاحب علم کے اوپر ایسے اصحاب ہیں جو علم و فضل میں بڑھے چڑھے ہوتے ہیں ۔ لہٰذا ہر عالم سے امام وقت کے فرائض متعلق نہیں کئے جائیں گے ۔ یہی حال اہل عرفان کا ہے کہ ان کے بھی مدارج ہیں ۔ کوئی اولیاء اللہ میں شامل ہیں تو کوئی ابدال کے درجہ پر فائز ہیں ۔ کوئی اوتاد کہلاتے ہیں ۔ کوئی قطب وقت ، کوئی قطب الاقطاب ، کوئی غوث اور کوئی ان سے بھی بڑھ کر غوث اعظم ۔ کوئی تبع تابعین اور کوئی تابعین اور کوئی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔ پھر اصحاب رسول کے بھی مدارج ہیں ۔

درجات بعضها فوق بعض۔ یہ مراتب درجات ہیں جو ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہیں۔"

سورۂ تین اور سورۂ عصر کی تقریر کا باہمی فرق

سورۂ تین میں بھی اسی طرح ارشاد ہوا تھا۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات فلھم اجر غیر ممنون۔ بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا بہترین قامت اور انداز میں، پھر اس کو ہم نے لوٹا دیا نچلے سے زیادہ نچلے درجہ میں، مگر جو لوگ یقین لائے اور عمل کرتے رہے نیک اور شائستہ تو ان کے لئے ہے ثواب کبھی ختم نہ ہونیوالا"

اور یہاں ارشاد ہو رہا ہے:۔ ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات۔ بے شک انسان گھاٹے اور نقصان میں ہے مگر وہ لوگ جو یقین لائے اور عمل کرتے رہے نیک اور شائستہ (وہ اس گھاٹے اور نقصان سے دور ہیں)" دونوں جگہ کی تقریر ایک سی ہے فرق اس قدر ہے کہ سورۂ تین میں انسان کی جسمانی ساخت سے بحث فرمائی گئی تھی کہ باوجود اسکو اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانہ پر بنانے کے جب وہ ایمان اور عمل صالح سے دور رہا تو اعلیٰ پیمانہ کی جسمانی ساخت وہ کیسی ہی وضعدار خوبصورت، حسن وجمال کی حامل ہو اسفل سافلین میں

پھینک دینے کے قابل ہو گئی۔ ہاں ان میں سے جو ایمان لائے اور شائستہ کاموں میں لگے رہے ان کا کیا پوچھنا صورت بھی اچھی اور سیرت بھی نورانی نور علی نور۔ اور یہاں سورۂ عصر میں نفس انسانی سے بحث ہے کہ اگر وہ ایمان و عمل صالح سے عاری ہو تو وہ کتنی ہی کثرت تعداد میں ہو اور کیسی ہی دولت و ثروت رکھتی ہو سراسر گھاٹے اور خسارے میں ہے۔ البتہ انسان اگر اللہ سبحانہٗ کی بتائی ہوئی باتوں پر یقین رکھے اور اس کے بتائے ہوئے اعمال و احکام کا کار بند ہو تو اس کی زندگی کامیاب ہے اگرچہ ایسے لوگوں کی تعداد کم ہو اور دنیوی دولت و ثروت کے اعتبار سے تہی دست ہو۔

دوسرا فرق دوسرا فرق ان دونوں سورتوں میں جو الذین آمنوا و عملوا الصالحات وارد ہوا ہے یہ ہے کہ سورۂ تین میں انسان کے درجۂ کمال سے انحطاط کی طرف جانے کا بیان ہوا تھا کہ انسان جب پیدا ہوا تو وہ احسن تقویم میں تھا۔ مگر ایمان و عمل صالح سے دوری اختیار کرنیکی وجہ سے اسفل سافلین میں جا پہنچا۔ اور سورۂ عصر میں اس کے برعکس درجۂ تنزل سے ترقی کی طرف جانے کا بیان ہو رہا ہے کہ جب تک وہ ایمان اور عمل صالح سے دور رہے گھاٹے میں ہے اور اگر وہ صفت ایمان و عمل صالح سے آراستہ ہو تو

پھر اس کو کسی نقصان اور خسارے کا اندیشہ نہیں۔ بلکہ ایمان لانے کے بعد اعمال صالحہ میں جیسی جیسی ترقی کرتا جائے اسی مناسبت سے وہ ترقی کا ایک ایک زینہ طے کرتے ہوئے معراج کمال پر جا پہنچیگا۔

دوسری تفسیر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان دونوں سورتوں میں جو اِلَّا الذین آمنوا وعملوا الصالحات وارد ہوا ہے اس سے نفس انسانی کی حالت کا بیان مراد لیا جائے۔ فرق صرف اس قدر کہ سورۂ تین میں انسان کی استعداد فطری کی طرف اشارہ مقصود ہو جو بمنزلہ راس المال کے ہے کہ ہر انسان کی فطری استعداد ایک ہی ہے۔ اور سورۂ عصر میں انسان کے میدان عمل میں قدم رکھنے کا بیان فرمایا جا رہا ہے کہ انسان اپنی فطری استعداد کے ساتھ جب عمل کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک وہ جو ایمان وعمل سے دوری اختیار کرے تو ظاہر ہے کہ اس کی فطری استعداد کھوئی گئی۔ اور اگر ایمان وعمل صالح کی صفات سے متصف ہوا تو اس نے راس المال کو محفوظ رکھ کر خوب فائدہ کمایا اور اس کی زندگی ہر طرح کامیاب رہی۔

وتواصوا بالحق کی تفسیر وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ۔ اور ایک دوسرے کو باہم تاکید کرتے رہے حق پر قائم رہنے کی۔ تیسرا گروہ جو خسران ونقصان سے

مستثنیٰ اور دور ہے ان لوگوں کا ہے جو حق پر قائم رہنے کی تاکید کرتے رہے۔
اللہ سبحانہ پر ایمان لانے اور اس کی بتائی ہوئی باتوں کا یقین کرنے کی بدولت
وہ دائمی خسارے سے نجات پا چکے تھے۔ پھر نیک کاموں میں لگے رہنے کی برکت
سے وہ اس قابل ہوئے کہ دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کے
حق دار ہوئے۔ کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں اور عمل صالح کے بغیر
دوسروں پر حکومت کرنے کا کوئی حق پیدا نہیں ہو سکتا جب یہ دونوں اوصاف
کسی میں جمع ہو گئے تو ان کو حق پیدا ہو گیا کہ دوسروں کو بھی حق کی دعوت دے
سکیں۔ اب یہ امر تحقیق طلب رہ جاتا ہے کہ حق سے کیا مراد ہے جس کی طرف دعوت
دعوت دی جائے؟

الحق سے قرآن مراد ہے حضرت قتادہ، حضرت مجاہدؒ اور حضرت حسن بصری
رحمۃ اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں: ــ الحق کتاب اللّٰہ۔ (ابن جریر) "حق سے
اللہ سبحانہ کی اتاری ہوئی کتاب (قرآن کریم) مراد ہے" اور حضرت مقاتلؒ
فرماتے ہیں: ــ بالایمان والتوحید (مظہری) یعنی ایک دوسرے کو
تاکید کرتے رہتے ہیں ایمان پر قائم رہنے اور اللہ سبحانہ کی وحدانیت کا
اقرار کرتے رہنے کی" ایمان میں وہ تمام ایمانیات داخل ہیں جن کا بیان

ایمان مجمل اور ایمان مفصل میں کیا گیا ہے۔ اور توحید سے مراد اس امر کی تصدیق اور اقرار کہ اللہ سبحانہ اپنی ذات اور صفات میں یکتا ہے کوئی ہستی کائنات کی اس میں شریک نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہ بیان مقصود ہے کہ خسارے اور گھاٹے سے وہ لوگ بھی مستثنیٰ ہیں جو نہ صرف اپنی ذات سے ایمان لائے اور یقین کامل رکھا اور نہ صرف خود اچھے کام کرتے رہے بلکہ دوسروں کو بھی دعوتِ حق دیتے رہے اور اعمال صالحہ پر قائم رہنے کی تاکید کرتے رہے۔ کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ انسان جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے دوسروں کے لئے بھی اس کو پسند کرے اور جو چیز اپنے لئے ناپسند کرتا ہو دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرے۔ یہی علامت مومن کامل کی ہے۔

الحَقّ سے مراد ناقابل انکار حقیقت دیگر مفسرین کرام نے حق کی تفسیر یوں فرمایا:— وصّٰی بعضھم بعضا بالامر الثابت الذی لا سبیل الی انکارہ ولا زوال فی الدارین لمحاسن آثارہ وھو الخیر کلّہ من الایمان باللہ عزوجلّ واتّباع کتبہ ورسلہ فی کلّ عقد و عمل۔ یعنی وہ ایک دوسرے کو تاکید کرتے رہے ان امور کی جن کا ثبوت محقق طور پر موجود ہے ایسا کہ ان کے انکار کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکتی۔ اور دونوں جہاں میں اس کے محاسن آثار کبھی مٹ نہیں سکتے۔ یعنی ہر امر خیر کے

اختیار کرنے کی تاکید کرتے رہتے ہیں۔ خواہ وہ خدائے عزوجل پر ایمان لانا ہو، یا اس کی کتابوں کا اتباع کرنا ہو یا اس کے رسولوں کی اقتداو پیروی کرنی ہو۔ ہر امر میں جو اپنی ذات سے متعلق ہو یا دو اشخاص، یا دو جماعتوں کے درمیان دائر ہوئے مثلاً نماز، روزہ، یہ ایسی عبادات ہیں کہ ان کا نفع ان کے ادا کرنے والوں کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ اور بعض کام ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق دو فریق سے ہوتا ہے مثلاً بیع و شراء، نکاح، معاہدہ وغیرہ کہ ان کی بجا آوری اور پابندی فریقین کے ذمہ عاید ہوتی ہے۔ غرض یہ تمام امور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق انجام پانے چاہئیں۔ وتواصو بالحق میں حق سے خواہ کتاب اللہ مراد لی جائے، یا ایمان و توحید، یا جملہ امور خیر۔ ہر ایک تفسیر اپنی جگہ درست ہے۔ ان میں باہم تضاد نہیں۔ سب کا مآل اور نتیجہ ایک ہے۔

حق سے مراد باطل کی ضد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حق کی تاکید کرتے رہنے کا یہ مطلب لیا جائے کہ حق کی ضد جو باطل ہے اس سے دوری اختیار کی جائے۔ خواہ اس کا تعلق اعتقادات سے ہو یا عبادات سے، اعمال سے ہو یا اموال سے معاملات سے ہو یا معاہدات سے، ہر امر میں حق پر قائم رہیں۔ حق کہیں، حق حق کریں، باطل سے دور رہیں۔ مقابلہ اپنوں سے ہو یا پرایوں سے۔ معاملہ

رشتہ ناطے والوں کا ہو یا اجنبی لوگوں کا۔ بلکہ کوئی معاملہ اپنی ذات سے تعلق ہو تو اس میں بھی حق کا لحاظ رکھیں اور حق کو ہاتھ سے جانے نہ دیں کہ اسلام نام ہے دینِ حق کا۔ باطل کو دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں فتح مکہ ہوئی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دستِ مبارک میں چھڑی لئے ہوئے کعبۃ اللہ شریف میں بٹھائے ہوئے ایک ایک بت کو دھکا دیتے جاتے اور فرماتے تھے جآء الحقّ وزھق الباطل انّ الباطل کان زھوقا۔ جاء الحقّ وما یبدئ الباطل وما یعید۔ حق آیا یعنی سچا دین آیا۔ یا یہ کہ قرآن کریم آیا اور جھوٹ نکل بھاگا یقیناً جھوٹ نکل بھاگنے والا ہے " حق آیا اور باطل آئندہ کبھی منہ نہ دکھا سکیگا " چھڑی کے اشارہ پر ایک ایک بت اوندھے منہ گرتا جارہا تھا۔ اس طرح تین سو ساٹھ بت جو کعبۃ اللہ شریف میں بٹھائے گئے تھے کعبۃ اللہ شریف ان سب سے پاک صاف ہو گیا جس پر اب چودہ سو سال ہوتے ہیں کہ قرآن کریم کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ بہر حال اس آیہ کریمہ میں ہر امر خیر کے کرتے رہنے کی تاکید کا حکم دیا گیا ہے۔

وتواصوا بالصبر کی تفسیر	وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ اور تاکید کرتے رہے صبر کی یعنی تکلیف۔ و رنج کو سہنے کی " ایمان لانے اور

عمل صالح کرتے رہنے، اور حق پر قائم رہنے کی تاکید کرتے رہنے کے سلسلہ میں جو تکالیف شاقہ برداشت کرنے پڑتے ہیں ان کو سہتے رہنے کی تاکید کیا کرنا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ تواصی بالحق میں، تواصی بالصبر بھی داخل تھا۔ لیکن تواصی بالصبر کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو مستقل طور پر بیان فرمایا جارہا ہے تواصی بالصبر کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر انسان میں صبر و استقامت نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ ایمان متزلزل، اور عمل صالح ناتمام، اور تواصی بالحق جس کا بیان اوپر کیا گیا بے معنی ثابت ہو کر رہ جائے۔ پھر ان امور ثلاثہ کا فائدہ کما حقہٗ حاصل نہ ہو۔ اور ساری کوشش و کاوش بے نتیجہ ہو جائے۔

صبر کی اہمیت صبر کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔ الایمان بضع وسبعون شعبۃ۔ ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں۔" اور دوسرے موقع پر فرمایا:۔ الصبر نصف الایمان۔ ان میں سے صرف ایک صبر آدھا ایمان ہے۔" جو کم از کم چھتیس شاخوں پر حاوی ہے۔ گویا ایک صبر کی صفت حاصل کرنے سے ایمان کی آدھی شاخیں ہاتھ آجاتی ہیں۔ یہ بھی ارشاد ہوا:۔ الصبر مفتاح الفرج صبر کامیابی اور کشائش کی کنجی ہے۔" جس انسان میں یہ وصف جس درجہ غالب

ہوگا اس کو اسی کی مناسبت سے اپنے کاموں میں کامیابی حاصل ہوگی حضور اقدس
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوا:۔ واصبر وما صبرك الا باللہ ولا
تحزن علیھم ولا تك فی ضیق مما یمکرون۔ اور اے نبی کریم آپ
ہر مشکل میں جو آپ کو درپیش ہو آپ صبر فرماتے رہیں۔ اور آپ کا ہر امر میں صبر فرماتے
رہنا، اللہ سبحانہ کی اعانت ہی سے ہے ان کفار کے ناروا سلوک سے آپ
اندوہگیں نہ رہا کریں اور آپ کے خلاف جو کارسازیاں یہ لوگ کر رہے ہیں ان سے
آپ دل تنگ نہ ہوں " یعنی آپ ذرا صبر سے کام لیجئے پھر دیکھئے کہ کفار کی یہ
ساری چال بازیاں کس طرح خاک میں مل جائینگی اور دیکھتے دیکھتے کیسی کامیابی
آپ کو حاصل ہوگی؟ اسی طرح امت مرحومہ کو سراہا گیا:۔ الصابرین
فی البأساء والضراء وحین البأس۔ جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں
ان کی صفت یہ ہے کہ وہ تکالیف شاقہ اور ضرر رساں مواقع میں نیز
حالت جنگ میں بڑے ہی صابر ہیں" جب آپ خود ایسے صابر واقع ہوئے
ہیں اور آپ کے رفقائے کار کی بھی یہ صفت ہے تو یقین جانئے کہ ہماری اعانت بھی
آپ کے ساتھ ہے اور کامیابی بھی آپ ہی کے ہاتھ ہے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ
میں جو فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوئیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔

صبر کا مرتبۂ عبادت وعبودیت

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تواصوا بالحق سے مرتبۂ عبادت مراد لیا جائے یعنی ایسے کام کرتے رہنے کی تاکید جن سے حق سبحانہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل ہو۔ اور و تواصوا بالصبر سے مرتبۂ عبودیت مراد لیا جائے کہ حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کے ساتھ جو سلوک بھی ہو اس پر نہ صرف صبر سے کام لے بلکہ اس پر اپنی رضا و خوشنودی کا اظہار کرے اور نہ صرف اظہار بلکہ اس کو جان و دل سے قبول کرے کیونکہ ارشاد باری ہے:۔ واللہ یحب الصابرین۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ تکالیف کے سہنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔" محب جو سلوک بھی کرے وہ محبوب کی مسرت کا موجب ہوتا ہے لہذا نہ صرف خود تکالیف الٰہیہ سے راضی اور خوشنود رہے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتا رہے۔

تواصوا کہنے کی وجہ تخصیص

یہاں تواصوا بالحق اور تواصوا بالصبر فرمایا گیا۔ وعظ و نصیحت یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ ارشاد نہیں ہوا یہ اس لئے کہ تواصوا وصیت سے مشتق ہے۔ وصیت آخری حکم کو کہتے جو انسان یہاں سے چل چلاؤ کے موقع پر کرجاتا ہے۔ اس میں اشارہ ہے اس امر کی جانب کہ وصیت کرنے والے اپنی خودی کو فنا کر چکے ہیں۔ فانی فی اللہ باقی باللہ کے

رنگ میں رنگے ہوئے اور موتوا قبل ان تموتوا کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔ مرنے سے پہلے مرچکے ہیں۔ اس عالم میں آنے کے بعد ان کی جو فرمائش بھی دوسروں سے ہوگی وہ حد درجہ دل نشیں ہوگی اور ہر شخص جو اس فرمائش کو سنا ہوگا وہ دل وجان سے اس کی تعمیل وتکمیل پر مائل ہوگا اور بہر صورت بلکہ بہر قیمت اس کی تکمیل کرکے ہی دم لیگا۔ اگر تواصی کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ ارشاد ہوتا تو یہ مطلب حاصل نہ ہوتا۔

ایک نکتہ نیز یہاں آمنوا، عملوا اور تواصوا یہ تمام صیغے ماضی کے ارشاد ہوئے ہیں۔ حال و استقبال کے صیغے یؤمنون، یعملون اور یتواصون نہیں لائے گئے۔ اگر حال و استقبال کے صیغے لائے جاتے تو یہ سمجھا جاتا کہ ان صفات کے حاصل کرنے کا گویا حکم دیا جارہا ہے۔ اس کی تعمیل آئندہ زمانے سے متعلق ہوتی۔ برخلاف اس کے ماضی کے صیغے لائے جانے سے یہ فائدہ ہوا کہ گویا یہ لوگ صفات مذکورہ کے ساتھ پیشتر ہی سے موصوف ہیں اس لئے یہاں ان کی تعریف وتوصیف فرمائی جارہی ہے۔ ان لوگوں سے زمانہ آئندہ میں ان صفات کی تحصیل کا مطالبہ نہیں کیا جارہا ہے بلکہ یہ صفات چونکہ ان میں پہلے سے موجود ہیں اب ان سے ان اوصاف پر محض ثابت وبرقرار رہنے کا مطالبہ ہے اور بس۔ اس تقریر میں جو لطف ہے وہ ارباب ذوق پر مخفی نہیں۔

سورۂ والعصر سے صحابۂ کرام کا شغف

بہرحال کسی قوم کے دونوں جہاں میں کامیاب قوم کہلانے کیلئے یہ چار صفات اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایمان عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ حضرت ابوحذیفہؓ فرماتے ہیں: ــ کان الرجلان من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا التقیا لم یتفرقا حتی یقرأ احدھما علی الآخر سورۃ والعصر ثم یسلم احدھما علی الآخر۔ (طبرانی، بیہقی) حضرت رسول اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو اصحاب کی جب آپس میں ملاقات ہوجاتی تو سورۂ شریفہ والعصر اپنے ساتھی کو پڑھ سنائے بغیر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوا کرتے تھے۔ جب کوئی ایک صاحب اپنے دوسرے صاحب کو یہ سورت شریفہ سناچکے تو ایک دوسرے کو سلام کرکے رخصت ہوتے۔" اس عملدرآمد سے پایا جاتا ہے کہ صحابۂ کرام کو اس بارے میں کیسا اہتمام تھا؟

سورۂ والعصر کی جامعیت

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا: ــ لولم ینزل غیر ھذہ السورۃ لکفت الناس۔ اگر اس سورت شریفہ کے سوا قرآن کریم کی اور کوئی سورت نازل نہ ہوتی تو بھی یہی ایک سورت تمام لوگوں کی ہدایت کے لئے کافی تھی۔" علمائے کرام فرماتے ہیں: ــ لانھا شملت جمیع علوم القرآن۔ کیونکہ یہ سورت شریفہ باوجود اتنے اختصار کے" قرآن کریم کے جملہ علوم پر مشتمل ہے۔"

امر بالمعروف کا ترک موجب خسران

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اپنی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں :۔
الامر بالمعروف والنہی عن المنکر واجب من ترکہ کان من الخاسرین ۔بھلائی کا حکم دینا، اور برائی سے روکنا، شرعاً واجب ہے جس نے اس فریضہ کو ترک کیا اس کا شمار بھی گھاٹے میں رہنے والوں اور نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا" کیونکہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :۔ من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہٖ فان لم یستطع فبلسانہٖ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان ۔ (مسلم) تم میں سے جو کوئی شخص کسی خلاف شرع کام کو دیکھے تو چاہئے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے ۔ (یہ فریضہ حکام کا ہے) پھر اگر کسی سے یہ نہ ہو سکے تو اس کو اپنی زبان سے منع کردے ۔ (یہ کام علماء کرام کا ہے) پھر اگر یہ نہ ہو سکے تو اسکو اپنے دل میں برا جانے ۔ اور یہ ایمان کا ضعیف تر درجہ ہے (یہ کام عامۃ المسلمین کا ہے)

نہی عن المنکر کے ترک پر وعید

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں :۔
ما من قوم یعمل فیھم المعاصی ثم یقدرون علی ان یغیروا ولا یغیرون الا یوشک ان یعمھم العقاب (ابو داؤد شریف) جس کسی قوم میں گناہ رائج ہوتا ہے اور وہاں ایسے لوگ موجود ہوں جو اس کی اصلاح پر قادر ہیں پھر بھی وہ اصلاح نہ کریں تو قریب ہے کہ اس قوم پر عام عذاب نازل ہو " نیز حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ سے مروی ہے کہ حضور سرور کائنات علیہ التحیۃ والتسلیمات نے فرمایا :۔

لا یعذب اللہ العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظہرانیہم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلم ینکروہ فاذا فعلوا ذلک عذب اللہ العامۃ والخاصۃ ۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ، بغوی) عادۃ اللہ اس طرح جاری ہے کہ چند لوگوں کے گناہ کرنے سے اللہ سبحانہ تعالیٰ تمام لوگوں کو مبتلائے عذاب نہیں فرماتا تا آنکہ عام لوگ اپنے روبرو، چند آدمیوں کو گناہ کرتا ہوا دیکھتے رہیں اور باوجود قدرت رکھنے کے ان پر انکار نہ کریں۔ جب صورت حال ایسی ہو جائے تو اللہ سبحانہ عام و خاص سبھی کو عذاب میں مبتلا فرماتا ہے " گناہ گاروں کو گناہ کی پاداش میں اور دوسروں کو اس سے منع نہ کرنے کی بنا پر۔ کیونکہ گناہ سے راضی رہنا بھی گناہ ہے اس باب میں اور بھی بکثرت احادیث شریفہ وارد ہوئی ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

رحمت الٰہی کی وسعت مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سورت شریفہ میں گھاٹے اور خسارے کی نسبت صرف اسی قدر فرمایا:۔ والعصر ان الانسان لفی خسر "سارا زمانہ گواہ ہے کہ یقیناً نوع انسانی بالضرور بڑے خسارے میں ہے" اور جو لوگ اس گھاٹے اور خسارے سے دور ہیں ان کی شان میں ارشاد فرمایا: الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔ مگر جو لوگ ایمان لائے

اور نیک کام کرتے رہے، اور حق پر قائم رہنے کی تاکید کرتے رہے اور (تکالیف پر) صبر کرتے رہے اور ان کو سہتے رہنے کی تاکید کرتے رہے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔" اسمیں حدیث قدسی سبقت رحمتی غضبی کی طرف اشارہ ہے جس میں باری تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہو رہا ہے کہ میری رحمت، میرے غضب سے کہیں سابق ہے۔" یعنی گھاٹے میں صرف ایک نوع اور فائدے میں چار انواع۔

مومنین صالحین کا دائمی ثواب حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

ان الانسان اذا عمر فی الدنیا وهرم فهو لفی نقص وتراجع الا المؤمنین فانهم یکتب لهم اجورهم ومحاسن اعمالهم التی کانوا یعملونها فی شبابهم وصحتهم (مظہری)

یہ یقینی ہے کہ انسان جب سن رسیدہ ہو جاتا اور بڑھاپے کو پہنچ کر ناکارہ ہو جاتا ہے تو اس کے روزمرہ کے کام گھٹتے جاتے اور تنزل کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ (یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے جس کو ہر کس و ناکس خوب جانتا ہے) مگر اہل ایمان کا معاملہ اور ہی ہے کہ وہ اپنی جوانی کے زمانے میں جو جو اعمال صالحہ کیا کرتے تھے اور تندرستی کی حالت میں جن کارہائے خیر میں حصہ لیا کرتے تھے۔ جب ان پر بڑھاپا غالب ہو جائے یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے وہ کام نہ کر سکیں تو وہ تمام محاسن اعمال اور ان کا ثواب پورا پورا ہر روز ان کے اعمال نامے میں ان کی وفات تک برابر لکھا جاتا رہتا ہے۔" اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہونے پاتی۔ غور کیجئے کہ یہ اللہ سبحانہٗ کی کیسی عنایت و قدردانی ہے۔

اس اعتبار سے ان آیات کریمہ کا مضمون سورۂ تاین کی ان آیات کریمہ سے ملتا جلتا ہے۔ جن میں ارشاد ہوا ہے: ۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات فلھم اجر غیر ممنون۔ بے شک ہم نے انسان کو بہترین قامت اور انداز ے پر پیدا کیا پھر اس کو نچلے سے نچلے درجہ میں ڈال دیا مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے تو ان کے لئے ثواب ہے کبھی ختم نہ ہونے والا" ہاں ان دونوں سورتوں کی آیات کریمہ میں جو فرق ہے اس کو اوپر بتلا دیا گیا ہے۔

سورۂ والعصر پڑھنے کی فضیلت حضور سید المرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیھم اجمعین کا ارشاد مبارک ہے: ۔ من قرأ سورۃ والعصر غفر اللہ تعالیٰ لہ وکان ممن تواصی بالحق وتواصی بالصبر۔ (ابوالسعود) جس شخص نے سورۂ والعصر پڑھا اللہ سبحانہ تعالیٰ اس کو بخش دیگا اور اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو حق پر قائم رہنے کی تاکید کرتے رہے اور صبر کی تلقین کرتے رہے" واللہ الموفق۔

سورۂ عصر کی تفسیر ختم ہوئی وللہ الحمد۔ وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔
